بحث ونظر

معاشرہ کا مطالعہ انداز فکر اور مسائل

ڈاکٹر جمیل فاروقی

معاشرہ کا مطالعہ اتنا ہی قدیم وجدید ہے جتنا کہ معاشرہ بذات خود۔ انسانی تہذیب کی ابتدا ہی سے معاشرہ انسانی علم کی توجہ کا مرکز رہا ہے مختلف لوگوں نے معاشرہ کا مختلف زاویہ ہائے نگاہ اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے مطالعہ کیا اور اس کے مختلف پہلوؤں اور عناصر کو اجاگر کیا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں معاشرہ کے مطالعہ نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ یہ وہ دور تھا جب تمام یورپ ایک بحران کا شکار تھا۔ دو انقلابات رونما ہو چکے تھے اور اپنے اثرات اس طرح چھوڑ گئے تھے کہ ایک افراتفری کا عالم تھا۔ لوگوں میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرتی تعلقات کی بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں اور معاشرہ کی ہم آہنگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ غربت و بیکاری بھی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس دگرگوں حالت نے اہل نظر اور اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کیا انھوں نے معاشرہ کی تعمیر نو پر زور دیا تاکہ اس بحران کا خاتمہ ہو اور آئندہ اس کے امکانات کم سے کم تر ہو جائیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں بہت سی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ تاریخ کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یورپ میں دو اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ ایک طرف طبعیاتی علوم ارتقا کی منزلیں تیزی سے طے کر رہے تھے ان کے نتیجے میں نئی نئی ایجادات نے انسان کو نہ صرف متحیر کر دیا تھا بلکہ انھیں نئے فوائد اور نئی لذت سے روشناس کرایا تھا مشینوں کا استعمال بڑھ رہا تھا۔ ٹیکنولوجی کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور مشین اور ٹیکنولوجی پر منحصر ایک نئی طرز زندگی نمودار ہو رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان بدلتے ہوئے حالات کو کس طرح معاشرہ اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ کیا نئی طرز زندگی پرانے خیالات کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں نئی طرز زندگی

سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے پرانے خیالات کو بدل کر نئے خیالات کو اپنانا ہوگا۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر معاشرتی مفکرین نے معاشرہ کے بارے میں نئی نہج پر سوچنا شروع کیا۔ انھوں نے دو باتوں کا تجزیہ کیا۔ اول معاشرہ میں پیدا ہونے والے طبعیاتی حالات کا۔ دوم معاشرتی علوم میں پیدا ہونے والے نظریات و رجحانات کا۔ آیئے ہم غور کریں کہ کیسے حالات بدلے اور معاشرہ پہ ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

طبعیاتی حالات

قرون وسطیٰ کے اختتام پر یورپ کے معاشرہ میں کچھ اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مثلاً تجارت کا فروغ ہوا۔ معاشرتی زندگی کے اہم مراکز کی حیثیت سے نئے شہروں کا ارتقا ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں ایک نیا طبقہ ابھرا جسے متوسط طبقہ کہا گیا اور جس نے بعد میں معاشرہ کی تبدیلی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ عہد جدید کا آفتاب نئی آب و تاب کے ساتھ نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کی صورت میں چودھویں صدی کے شروع میں مغرب کے افق پر نمودار ہوا۔ نشاۃ ثانیہ نے اپنی حیرت انگیز ایجادات، نت نئے خیالات و افکار اور مادی فوائد کے ذریعہ انسان کو یہ باور کرایا کہ اس کا ماضی اس کے فطری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں تھا اس کا وجود استحصال کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور وہ ایک ہارے ہوئے زخم خوردہ سپاہی کی طرح اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ زندگی کی معراج تو وہ آرام دہ اور لذت آمیز زندگی ہے جو اسے نئے خیالات و افکار کو اپنا کر ملنے والی ہے۔ ظاہر ہے اس خیال نے انسانی ذہن کو بے حد متاثر کیا اور انسان کے مطمح نظر میں ایک تبدیلی آئی۔ فن ادب اور سائنس میں نئے رجحانات کا آغاز ہوا۔ زندگی میں نئی خوبصورتی تلاش کی جانے لگی نشاۃ ثانیہ نے یورپ میں مختلف تبدیلیاں رونما کیں۔

علم کا اس طرح فروغ ہوا کہ قدیم تصورات بے وزن بلکہ بے بنیاد محسوس ہونے لگے اور نئے تصورات ان کی جگہ لینے لگے۔ اس سلسلہ میں جو علمی اور فکری کام ہوئے ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) ڈانٹے (DANTE) نے ٹسکن (TUSCON) زبان میں جو بعد میں اطالوی زبان کہلائی اپنی مشہور زمانہ نظم (DEVINE COMEDY) کی تخلیق کی۔ اس نظم میں شاعر

نے جنت سے جہنم تک ایک خیالی سفر کا تذکرہ کیا جو اس زمانہ کے طرز زندگی پر ایک گہری تنقید تھی۔ پیٹرارک (PETRARCH) ہیومنزم (HUMANISM) کا موجد کہلایا کی اطالوی زبان میں شاعری بھی اسی ذیل میں آتی ہے یہ اس معاشرہ پر زبردست تنقید تھی۔ اٹلی میں تین اور اہم فنکار پیدا ہوئے۔ لیونارڈو۔ ڈی۔ ونچی (LEONORDO DA VINCI) کی تخلیق دی لاسٹ سپر (THE LAST SUPPER) اور مونولیزا (MONO LISA) ۔ مائیکلینگو (MICHE LANGO) کی تخلیق دی لاسٹ ججمنٹ (THE LAST JUDGMENT) اور دی فال آف مین (THE FALL OF MAN) اور رافئیل (RAPHEL) کی تخلیق میڈونا دی مدر آف جیسس کرائسٹ (MADONNA THE MOTHER OF JESUS CHRIST)۔

(۲) شمالی یورپ کے ایک مشہور مفکر ایراسمس (ERASMUS) نے کلیسا کی خرابیوں کو نمایاں کیا۔ برطانوی مفکر تھامس مور (THOMOS MORE) نے اپنی کتاب اٹوپیا (UTOPIA) میں ایک مثالی معاشرہ کا ذکر کیا۔ مکاولی (MACHIAVELLI) نے دی پرنس (THE PRINCE) میں ریاست کا ایک نیا تصور دیا اور حکومت کرنے کے طریقہ سے بحث کی۔ ریاست کو ایک خودمختار اور اعلیٰ ادارہ ثابت کیا اور اسے مذہب سے آزاد کرنے پر زور دیا۔ فرینسس بیکن (FRANCIS BACON) کے مضامین اور شیکسپیر (SHAKESPEAR) کے ڈراموں نے بھی غیر معمولی اثرات ڈالے۔

(۳) ۱۵ ویں صدی کے وسط میں چھاپہ خانہ کی ایجاد ہوئی جس کا سہرہ گیٹنبرگ اور کاسٹر (GUTEN BERGNARD COSTER) کے سر جاتا ہے۔ اس چھاپہ خانہ سے پہلی کتاب گیٹنبرگ کی بائبل (GUTENBERG BIBLE) شائع ہوئی۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد سے کتابوں کی اشاعت سستی۔ آسان اور خوبصورت ہوگئی جس سے زیادہ سے زیادہ کتابیں لکھی جانے لگیں۔

(۴) سائنس کا فروغ ہوا۔ کائنات کے علم اور اس کے رموز کی تلاش سائنس کے ارتقاء کا باعث بنی۔ اس سلسلہ میں فرنیسس بیکن کا قول بہت اہم ثابت ہوا جب اس نے کہا کہ علم محض مشاہدہ (OBSERVATION) اور تجربہ (EXPERIMENTATION) سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انسان جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے پہلے اسے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اس کے بعد ان کے اسباب تلاش کرنے چاہیے اور جب اسباب معلوم ہوجائیں تو ان کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرنا چاہیے۔ پھر تجربہ کرنا چاہیے کہ یہ

نظریہ کہاں تک صحیح اور درست ہے۔ اسی کو سائنسی طریقہ کار اور انداز فکر سمجھا جاتا ہے۔ کوپرنیکس (COPERNICUS) پہلا یورپ کا سائنس داں تھا جس نے یہ انکشاف کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ پولینڈ کا رہنے والا تھا اور بہت دنوں سے اٹلی میں قیام پذیر تھا۔ گیلیلو (GALILEO) نے جو کوپرنیکس سے ۲۴ سال بعد پیدا ہوا۔ کوپرنیکس کے نظریہ کی تائید کی اور ایک ایسی دوربین (TELESCOPE) بنائی جس سے اس نے سورج، ستاروں اور دوسرے سیاروں کو دیکھا۔ بعد میں جرمنی کے ایک سائنس داں کیپلر (KEPLER) نے یہ بتایا کہ کس طرح سیارے سورج کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ اس نے وہ اصول بھی واضح کیے جو ان کی گردش کو متعین کرتے ہیں۔ آزک نیوٹن (ISAAC NEWTON) نے اس کام کو آگے بڑھایا اور بتایا کہ چیزیں اصول کشش (LAW OF GRATIFICATION) کے ذریعہ حرکت میں آتی ہیں۔ اس طرح سائنس دانوں نے نہ صرف انسانی علم میں اضافہ کیا بلکہ ایک مخصوص طریق کار اور اسلوب کی بھی جسے سائنسی اسلوب کہتے ہیں وضاحت کی۔

(۵) پروٹسٹنٹ اصلاحات۔ کیتھولک کلیسا کے خلاف آواز بلند کی گئی اور قومی کلیسا کی بنیاد ڈالی گئی جو پوپ کے شکنجے سے آزاد تھا۔ کلیسا کی مخالفت اس وقت زور پکڑ گئی جب جرمنی کے مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER) نے ۱۵۱۷ء میں کلیسا کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ مارٹن لوتھر کے خیالات جب یورپ کے دوسرے ممالک پہنچے تو سوئزر لینڈ کے جان کالون (JHON CALVIN) نے لوگوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا اور ہر شعبہ زندگی کے بارے میں اپنا الگ نظریہ پیش کیا۔ کالون کے نظریہ سے اتفاق رکھنے والے لوگ برطانیہ اور امریکہ میں پیوریٹنس (PURITANS) سکاٹ لینڈ میں پریس بیٹیرینس (PRESBYTERIANS) اور فرانس میں ہیوگوناٹس (HUGUENOTS) کہلائے۔ ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کے حکمرانوں نے بھی لوتھر کے مذہب کو اختیار کر لیا۔ برطانیہ میں ہنری ہشتم نے کلیسا کے سربراہ ہونے کا دعویٰ اس وقت کیا جب پوپ نے اس کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہیں دی۔ ۱۵۰۹ء میں ملکہ الزبیتھ اول نے برطانیہ کے کلیسا کو سرکاری کلیسا بنایا۔ اس طرح برطانیہ مذہبی مجادلہ سے دوچار رہا اور یہ مجادلہ ایک صدی تک چلتا رہا۔ بہرحال ۱۷ویں صدی تک آدھے یورپ نے پروٹسٹنٹ خیالات کو کسی نہ کسی شکل میں اختیار کر لیا۔

(۶) مختلف خطوں کی کھوج ، دوسروں کو جاننے اور سمجھنے اور تجارت کو فروغ دینے

کے جذبہ نے لوگوں کے اندر طویل اور دور دراز کے سفر کا رجحان پیدا کیا جس کے نتیجہ میں واسکوڈی گاما (VASCO-DA GAMA) نے بڑی دشواریوں اور صعوبتوں کو برداشت کرکے ایک بحری سفر کیا اور ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کے شہر کالی کٹ پہونچا۔ کولمبس (COLUMBUS) ۱۴۹۲ء میں ہندوستان کی تلاش میں ایک ایسے خطہ پر پہونچا جسے بعد میں امریکہ کہا گیا۔ اسی طرح میگلان نے بحری سفر کے ذریعہ ایک خطہ کی کھوج کی جسے آج کل فلپائن (PHILIPPINE) کہتے ہیں نئے خطوں کی کھوج سے تجارت کو بہت فروغ ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پڑی۔

صنعتی انقلاب

برطانیہ میں صنعتی انقلاب ۱۷۵۰ء میں شروع ہوا۔ اس کے ذریعہ روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی اشیاء کی پیداوار انسانی اور حیوانی قوت کے بجائے مشینی قوت سے ہونے لگی۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد کو مشینی عہد کہا جانے لگا ۱۷۵۰ء کے بعد بڑے پیمانہ پر حیرت انگیز ایجادات ہوئیں جس سے معاشرہ میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی جس نے عوام کے ایک طبقہ کی معاشرتی زندگی کو متاثر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی اور کائنات کے بارے میں انسان کا نظریہ تبدیل ہوا۔

اس زمانہ میں پیداوار کا نظام اپنی افادیت کھو چکا تھا۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کی ضرورتیں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں اور موجودہ نظام ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں بالکل ناکارہ ثابت ہوچکا تھا۔ اس کو کارآمد بنانے کے لیے تاجروں نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ انھوں نے دستکاروں اور اہل حرفہ کو خام مال فراہم کرنا شروع کیا اور اسی کے ساتھ کچھ رقم ان کی ضرورتوں کے لیے دینے لگے۔ اہل حرفہ اپنے گھروں میں خاندان کے دوسرے افراد اور معمولی اوزاروں کی مدد سے کام کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیاء بننے سے پہلے ہی بڑے بڑے سرمایہ داروں اور تاجروں کی ملکیت ہوجاتی تھیں۔ وہ انھیں بازاروں میں بھیجتے تھے اور بے حساب منافع کماتے تھے۔ یہ نظام بعد میں صنعتی گھریلو نظام کہلایا۔

۱۷۵۰ء کے بعد کے دور میں پیداوار کا نظام بدلا اور اس کی جگہ فیکٹری نظام نے لی۔ چھوٹے موٹے اوزاروں کی جگہ قوی ہیکل مشینیں آگئیں۔ حیوانی وانسانی قوت کے بجائے بھا

کی قوت کا استعمال کیا جانے لگا۔ اشیاء کی پیداوار بڑی بڑی فیکٹریوں میں بڑے پیمانہ پر کی جانے لگی۔ پیداوار کے ذرائع سرمایہ داروں کی ملکیت میں آگئے۔ سرمایہ دار پیداوار میں کام آنے والی چیزیں یکجا کر کے مزدوروں کو فراہم کرتے تھے جو ایک چھت کے اندر یکجا ہو کر چیزیں بناتے تھے۔ تمام پیداوار کے مالک سرمایہ دار ہوتے تھے۔ مزدوروں کو صرف مزدوری دی جاتی تھی۔ فیکٹری نظام سے صنعتی انقلاب رونما ہوا جس میں چند افراد کم سے کم وقت میں بے انتہا مال پیدا کر سکتے تھے۔ اس نظام کا اثر یہ ہوا کہ مشینوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خام مال کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور پیدا شدہ مال کی کھپت کے لیے زیادہ سے زیادہ بازار تلاش کیے جانے لگے۔ نتیجہ کے طور پر پہلے برطانیہ اور بعد میں یورپ کے دوسرے ممالک نے دوسرے خطوں میں اپنا اقتدار جمانا شروع کر دیا۔

صنعتی انقلاب نے چند افراد کو بے انتہا فائدہ پہونچایا۔ مگر معاشرہ کا ایک بڑا طبقہ اس کے فوائد سے محروم رہا۔ بلکہ انھیں حد درجہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ چھوٹا طبقہ جسے سرمایہ دار کہتے ہیں صنعتی انقلاب سے سب سے زیادہ مستفید ہوا۔ فیکٹری، پیدا شدہ مال اور منافع سب بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت تھے اس کا واحد مقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا کم سے کم مزدوری دینا اور اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا۔ مزدوروں کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ ان کو نہ صرف کام کے اوقات کے مقابلہ میں مزدوری کم ملتی تھی بلکہ انھیں غیر صحت مند حالات میں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ انسانی فلاح و بہبود کے متعلق حکومت کی ذمہ داری کا خیال اس وقت کسی کو نہ تھا نتیجہ کے طور پر انسانوں کا استحصال خود انسانوں کے ہی ذریعہ ہونے لگا۔ یہ حالات کچھ عرصہ تک جاری رہے۔ صنعتی انقلاب کے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوئے۔

(۱) بڑے بڑے شہروں کا قیام عمل میں آیا۔ گاؤں سے زیادہ سے زیادہ لوگ شہروں کی طرف آنے لگے۔ شہر چونکہ پیداوار کے اہم مرکز تھے اس لیے روزگار کی تلاش میں لوگوں نے شہروں میں بسنا شروع کیا۔ اس سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے شہر کی آبادی میں اضافہ ہوا جس سے مکانوں کی قلت ہوئی۔ آبادی کی زیادتی سے گندگی بڑھی غیر صحت مند ماحول پیدا ہوا اور شہروں میں گندی بستیاں (SLUMS) نمودار ہوئیں۔

(۲) صنعتی سرمایہ داری کا فروغ ہوا۔ دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں اکٹھا ہونے

لگی جس کے نتیجہ میں کچھ گھرانے امیر سے امیر تر ہوتے گئے اور باقی ماندہ عوام غریب سے غریب تر۔

(۳) مزدوروں کے کام کرنے کے حالات کو سدھارنے کی بھی کوشش شروع ہوئی۔ یورپ کے معاشرہ میں یہ آواز اٹھائی جانے لگی کہ انسان کا استحصال برا ہے اور انسانوں کے حالات کو سدھارنا ایک معاشرتی فریضہ ہے۔ ۱۸۰۲ء میں برطانیہ میں فیکٹری قانون پاس ہوا جس کے ذریعہ بچوں کے کام کرنے کے اوقات گھٹا کر ۱۲ گھنٹہ رکھے گئے۔ ۱۸۱۹ء میں قانون کے ذریعہ ۹ سال سے کم عمر کے بچوں کے کام کرانے پر پابندی عائد کی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں ٹریڈ یونین قائم کی گئی بعد ازاں ۱۸۶۷ء، ۱۸۸۲ء، ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۹ء کے قوانین کے ذریعہ مزید سہولتیں دی گئیں۔

(۴) حکومت کی ذمہ داری کا احساس اجاگر ہوا۔ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ صنعتیت بے لگام نہیں ہونی چاہیے۔ اس پر حکومت کی گرفت ہونی چاہیے تاکہ اس کا غیر متناسب فروغ نہ ہو۔ اس احساس سے لیز فیئر (LAISSAZ FAIRE) کے نظریہ کو بہت دھکا لگا۔ صنعتیت کے فروغ سے سرمایہ داروں کا یہ نظریہ تھا کہ حکومت کو صنعت اور تجارت میں میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہے۔ آدم اسمتھ (ADAM SMITH) نے اپنی کتاب دی ولتھ آف نیشن (THE WEALTH OF NATION) میں اس نظریہ کی تشریح کی۔ لیکن اس پر تنقید کی گئی اور بتایا گیا کہ معاشی ترقی میں حکومت کا رول ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر شہری اور ہر طبقہ کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔

(۵) اشتراکیت کا ارتقا ہوا جس کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ریاست کو (ملک کے تمام شہریوں کو نہ کہ صرف چند اشخاص کو) پیداوار کے تمام ذرائع کا مالک ہونا چاہیے کیونکہ اسی صورت میں تمام لوگ (معاشرہ) پیداوار کے منافع میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔

معاشرتی انداز فکر اور نظریات

طبعیاتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی علوم میں نئے نظریات و رجحانات تیزی سے رونما ہوئے۔ معاشرہ کو سمجھنے اور اس کے تجزیہ کی نئی کوششیں سامنے آئیں۔ ان کا مختصر تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) معاشرتی معاہدہ کا نظریہ۔ اس کے مطابق ریاست و معاشرہ کا وجود ایک معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ معاشرہ کے وجود میں آنے سے قبل انسان 'قدرتی حالت' (NATURAL STATE) میں رہتے تھے جو کچھ مفکرین کے مطابق انتشار و بحران کی شکار تھی۔ لوگوں میں باہمی چپقلش اور مجادلہ تھا۔ انسانوں کے حالات بہت خراب تھے۔ ہر وقت جان و مال کا خطرہ لاحق رہتا تھا اس لیے مجبور ہوکر لوگوں نے اپنے اختیارات ایک تنظیم کو منتقل کر دئیے اور اس کے بدلے اپنی بقا کا تحفظ چاہا۔ کچھ مفکرین کے مطابق 'قدرتی حالت' اتنی خراب نہیں تھی۔ لوگوں نے اپنی ترقی اور بہتری کے لیے اپنے اختیارات منتقل کیے یہ نظریہ ۱۶۰۰ء سے لے کر ۱۸۰۰ء تک بہت نمایاں رہا۔ اس نظریہ کے حامیوں میں رچرڈ ہوکر RICHARD HOOKER (۱۵۵۲-۱۶۰۰ء) تھامس ہابس THOMOS HOBBS (۱۵۸۸ - ۱۶۷۹ء) جان لوکس JHON LOCKER (۱۶۳۲ - ۱۷۰۴ء) اور روسو ROUSSEAU (۱۷۱۲ - ۱۷۸۸ء) کے نام سرفہرست ہیں۔

(۲) ترقی کا نظریہ۔ اس کے تحت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ انسان اور اس کا معاشرہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ ہر دور میں کچھ شستگی اور بہتری آتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ننانوے فیصد انسان احساس و شعور کے بغیر ترقی کے مختلف منازل طے کیے ہیں۔ اس نظریہ کے علم برداروں میں دو نام مشہور ہیں ایک ہے برنارڈ ڈی فونٹ نیلے BERNARD DE FONTNELLE (۱۶۵۷ - ۱۷۵۷ء) اس نے اپنی مشہور کتاب ڈائیلاگ آف دی ڈیڈ (۱۶۸۳ء) DIALOGUES OF THE DEAD لکھی اور بتایا کہ قدیم انسان جدید انسان سے بہتر نہیں تھا۔ جہاں تک حیاتیاتی نظریہ کا سوال ہے قدیم و جدید انسان یکساں ہیں۔ اس نے اس نظریہ کی تردید کی کہ ماضی حال سے بہتر ہے۔ بہر حال اس کے مطابق انسان شستگی کی طرف گامزن ہے۔ دوسرا نام ہے چارلس پیرالٹ CHARLES PERRAULT (۱۶۲۸ - ۱۷۰۳ء) کا اس نے اپنی نسل میں تہذیبی کاملیت کو محسوس کیا۔ اور یہ بتایا کہ انسان بتدریج کاملیت کی طرف بڑھا ہے۔ ان کے مطابق موجودہ تہذیب کاملیت کا ایک نمونہ ہے۔

(۳) معاشی و معاشرتی انقلاب کا خیالی نظریہ۔ اس کے تحت یہ واضح کیا گیا کہ سیاسی ادارہ کی اصلاح انسانی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ مگر کوئی بھی سائنسی ترقی بے معنی ہے جب تک کہ اس کے ساتھ معاشرتی اور معاشی تبدیلیاں نہ لائی جائیں۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے

کہ معاشرتی اصلاح اس وقت تک بیکار ہے جب تک کہ یہ عوام الناس کی زندگی نہیں بدلتی۔
اس نظریہ کے حامل دو خیال پرست مفکرین تھے تھامس مور THOMOS MORE (۱۴۷۸-۱۵۳۵ء) جس نے ایک مثالی معاشرہ کی خیالی تصویر کھینچی اور کہا کہ یہ۔
(الف) خوبصورت جزیرہ اموریت پر قائم کیا جائے۔
(ب) اس میں دولت کی تقسیم تمام افراد میں برابر ہو۔
(س) جہاں ایک منظم قوم ہو اور جس کی بنیاد باہمی تعاون پر ہو دوسرا مفکر فرینسس بیکن FRANCIS BACON تھا۔ اس کے مطابق مثالی معاشرہ وہ ہے جسے جنوبی امریکہ کے کوسٹ کے جزیرہ پہ قائم کیا جائے۔ یہ تمام باتیں خیالی اور حقیقت سے دور تھیں۔

(۴) معاشرتی فلسفہ۔ ۱۸ویں صدی میں جب معاشرتی علوم نے طبعیاتی علوم کا اثر قبول کیا تو معاشرتی فلسفہ نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ معاشرتی امور کا مطالعہ سائنسی طریقہ کار اور اسلوب سے کیا جائے۔ اس طرح سائنسی اسلوب کی اہمیت پہ زور دیا گیا اور اس کو اپنانے کی ترغیب دی گئی۔ اس سلسلہ میں والٹیر VOLTAIRE ٹرگاٹ TURGOT، کانٹ KANT اور کنڈورسٹ CONDORECET کے نام مشہور ہیں۔ طبعیاتی علوم کا اثر ہمیں ۱۸ویں صدی کے معاشرتی اور سیاسی فلسفہ میں ملتا ہے گلیلو اور نیوٹن کی طبعیاتی امور کی تشریح معاشرتی مفکرین کو پسند آئی خاص طور سے نیوٹن کے اصول کشش کے نظریہ نے انھیں متاثر کیا۔ نیوٹن کے مطابق جب کسی شے کو فضا میں اچھالا جاتا ہے تو وہ زمین کی طرف گرتی ہے۔ یہ ایک اصول کے تحت ہوتا ہے جسے زمین کی کشش کا قانون کہا جاتا ہے۔ معاشرتی مفکرین نے کہا کہ یہ تشریح معاشرتی اور سیاسی امور کی تشریح میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف جغرافیائی معلومات اور دنیا کے مختلف خطوں کی کھوج سے نئی نئی تہذیبیں اور کلچرس سامنے آئے۔ اس سے معاشرتی اداروں پر ناقدانہ نظر ڈالنے میں مدد ملی۔ اس کے علاوہ صنعتی انقلاب سے معاشرتی نظام کو جو دھکہ پہونچا تھا اس کا تدارک ضروری سمجھا گیا۔ اس کے لیے کچھ اصلاحات بھی ضروری سمجھے گئے۔ اس طرح معاشرہ میں جو نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے ان کے تدارک کے لیے اور ذہنی اور نظریاتی پراگندگی کو دور کرنے کے لیے ایک با اصول، بانظام تجزیاتی معاشرتی علم SCIENCE OF SOCIETY کی ضرورت محسوس کی گئی جس کے ذریعہ معاشرہ کا حقیقی مطالعہ کیا جا سکے اور اس کے مسائل

کا حل تلاش کیا جا سکے۔

(۵) معاشرہ کی جغرافیائی اور حیاتیاتی تشریح۔ اس کے تحت انسان کے برتاؤ اور معاشرہ پر جغرافیائی اور حیاتیاتی امور کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا۔ مانٹسکو MONTES QUIEU (۱۶۸۹—۱۷۵۵ء) نے اپنی کتاب دی سپرٹ آف لاز THE SPIRIT OF LAWS میں یہ واضح کیا۔

(الف) اداروں اور قوانین کا اطلاق ان انسانوں کے کردار کے مطابق ہونا چاہیے جن کے لیے یہ بنائے گئے ہوں۔

(ب) مختلف اداروں، قوانین اور دوسری تراکیب کے درمیان باہمی اشتراک و تعلق ضروری ہے تاکہ معاشرتی کنٹرول کو مؤثر بنایا جا سکے:

مالتھس MALTHUS (۱۷۶۶—۱۸۳۴ء) نے آبادی کا مطالعہ کیا اور یہ بتایا:۔

(الف) آبادی تناسب ہندسیہ (GEOMETRIC RATIO) (۱-۲-۴-۸-۱۶) سے بڑھتی ہے جبکہ روزی کے ذرائع تناسب حسابیہ (ARITHMETIC RATIO) (۱-۲-۳-۴) سے بڑھتے ہیں۔

(ب) نتیجہ کے طور پر آبادی کے اضافہ سے ہمیشہ روزی کے ذرائع پر زبردست دباؤ پڑتا ہے۔

مالتھس نے مزید بتایا کہ آبادی کو روکنے کے دو طریقے ہیں۔ اول مثبت طریقہ جو جنگ بھوک مری اور وبا کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ دوئم منفی طریقہ جواز دواجی زندگی دیر سے شروع کرنے یا کچھ اخلاقی پابندیاں عائد کرنے سے عمل میں آتا ہے۔

(۶) معاشرہ کی نفسیاتی تشریح۔ اس کے تحت معاشرتی عمل اور اداروں کی تشریح نفسیاتی اصول و نظریات کی مدد سے کی گئی۔ برکلے BERKELEY (۱۶۸۴—۱۷۵۳ء) نے اپنی کتاب سرمن آن پوزیٹو اوبیڈینس SERMON ON POSITIVE OBEDIENCE میں اپنا نظریہ پیش کیا۔

(الف) اس نے لاکس کے ذریعہ دئے گئے نظریہ انقلاب کی تنقید کی اور فطری سماجیت (NATURAL SOCIABILITY) کے نظریہ کی تائید کی۔ اس نے زور دیا کہ معاشرہ کو صحیح ڈھنگ سے چلانے کے لیے ایک حکومت کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ 'فطری سماجیت' کے نظریہ کی۔ اس نے مزید بتایا کہ ایک قائم شدہ حکومت کی اطاعت فطری ہے اور اسے فطری اصول سمجھا جانا چاہیے۔

(ب) اپنی کتاب پرنسپلس آف مارل اٹرکشن PRINCIPLES OF MORAL ATTRAC-TION

میں اس نے سائنسی اسلوب پہ مبنی معاشرتی نظریہ کی تشریح کی، برکلے نے پہلی دفعہ نیوٹن کے اصولوں کے لحاظ سے معاشرتی عمل کی تشریح پیش کی۔ اس کے مطابق معاشرتی جبلت اور اصولِ کشش میں مطابقت ہے جس طرح کائنات میں مختلف مادے ایک دوسرے کی طرف زیادہ قوت سے کھنچتے ہیں جب وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اسی طرح افراد معاشرہ میں ایک دوسرے کی طرف زیادہ قوت سے کھنچے ہیں جب انھیں ایک دوسرے میں مطابقت یا ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اس نے کہا وہ رجحانات جو انسان کو سماجیت اور باہمی اشتراک کی طرف لے جاتے ہیں مرکز جویا قوت (CENTRIPETAL FORCE) میں اور خود غرضی اور انفرادی خصوصیات مرکز گریز قوت (CENTRIFUGAL FORCE) ہیں۔ ایک مستحکم معاشرہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب پہلی قوت دوسری قوت کے مقابلہ میں زیادہ ہو۔

اس سلسلہ کا دوسرا مفکر ڈیوڈ ہیوم (DAVID HUME) (۱۷۱۱ — ۱۷۷۶ء) تھا جس نے معاشرتی معاہدہ کے نظریہ کی تاریخی و فلسفیانہ بنیادوں پہ تنقید کی اور اس کے پرخچے اڑا دیئے اس کے نظریہ کی بنیادی باتیں مندرجہ ذیل تھیں۔

(ب) معاشرہ کا آغاز جنسی جبلت کے ذریعہ ہوا جو ایک اہم معاشرتی امر (SOCIAL FACT) ہے اور جس کی بنا پر خاندان کا آغاز ہوا۔

(س) اس نے ہمدردی پہ زور دیا اور بتایا کہ معاشرتی جذب پذیریت (SOCIAL ASSI-MILATION) ایک خاص امر کی حیثیت سے ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ نقل کرنے کے عمل کے تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو معاشرتی گروہوں کو یک رنگیت بخشتا ہے۔

آدم اسمتھ (ADAM SMITH) نے اپنی کتاب تھیوری آف مورل سینٹمنٹ (THEORY OF MORAL SENTIMENT) میں ہمدردی کی معاشرتی اہمیت کو اجاگر کیا اور یہ بتایا کہ کوئی انسان اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی نہ لے اس سلسلہ کا آخری مفکر بینتھم (BENTHAM) (۱۷۴۸ — ۱۸۳۲ء) تھا جو فلسفہ لذتیت (HEDONISM) کے لیے مشہور ہوا۔ اس کے مطابق قدرت نے انسانوں کو دو مملکتوں کے ماتحت رکھا ہے، خوشی اور تکلیف۔ انسان ان کاموں کو کرتا ہے جس سے اس کو خوشی ملتی ہے اور ان کاموں سے پرہیز کرتا ہے جس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔

(۷) معاشرہ کے مطالعہ کا تاریخی نظریہ۔ اس کے تحت یہ بتایا گیا کہ معاشرہ کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں ہونا چاہیے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں سبق سکھاتا ہے کہ معاشرتی امور کس طرح ارتقا کے مراحل سے گذرے۔ کس طرح ان میں تغیر ہوا اور کس طرح مختلف حالات سے گذرتے ہوئے مختلف شکل وصورت اختیار کی۔ مختلف ادوار میں کن حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا ردعمل کیا ہوا۔ گیووانی بتیستا ویکو (GIOVANNI BATHISTA VICO) ایک اطالوی مفکر اس نظریہ کا حامی تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے معاشرہ کے مطالعہ کے لیے ایک علیحٰدہ نئی سائنس کی ضرورت محسوس کی اور اس کا نام لاسائنزا نووا (LA SCIENZA NAWA) رکھا۔ اس کے نظریات اس طرح ہیں۔

(الف) اس نے معاشرتی معاہدہ کے نظریہ کی تردید کی اور 'فطری سماجیت' کے نظریہ کو صحیح سمجھا اور اسی کے ساتھ اس نے معاشرتی تعلقات کی ضرورت بھی محسوس کی۔ اس کے مطابق منصب ایک ایسی قوت ہے جو لوگوں کو اجتماعی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(ب) تاریخی ارتقا اور نشو نما کا انحصار اجتماعی ذہن کی تخلیق اور تبدیلی ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بشری روح میں کس طرح اور کس قدر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

(س) اس نے تاریخی ارتقا کی تین اہم منازل بتائیں۔

(۱) فوق البشری (DIVINE) اس سطح پر روحانی تصور کے تحت خام خیالات و جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ سیاست میں اس کی مثال حکومت الٰہی (THEOCRACY) ہے۔

(۲) اولوالعزمانہ (HEROIC) اس میں اجتماعی ذہنیت پہ شاعرانہ تخیلات کا غلبہ ہوتا ہے اور اس کا مختلف شکل میں اظہار ہوتا ہے۔ سیاست میں اس کی مثال خواص کی حکومت (ARISTOCRACY) ہے۔

(۳) بشری (HUMAN)۔ اس سطح پر اجتماعی ذہنیت پر سائنسی علم کا اظہار ہوتا ہے جس کی مثال سیاسی آزادی۔ قانونی آمریت اور جمہوری سلطنت کے نظریات ہیں۔

ایمنیول کانٹ (IMMANUAL KANT) (۱۷۲۴-۱۸۰۴ء) جس کی شہرت کے ڈنکے آج بھی ایوان علم میں بج رہے ہیں اور جس کی آواز آج بھی ہمارے کانوں میں سنائی دیتی ہے۔ فلسفہ عقلیت کے لیے مشہور ہے جس کے مطابق علم صحیح کی بنا عقل پر ہے۔ کانٹ کے مطابق تاریخ قدرت کے منصوبے کو اجاگر کرنے کی دستاویز ہے۔ یہ منصوبے انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں

کے ارتقار سے متعلق ہیں۔ جوہن گوٹلب فیچے JHONN GOTTLIEB FITCHE (۱۷۶۲-۱۸۱۴ء) نے بتایا کہ انسانی کاملیت کا تجسس ہی ترقی کا محرک ہے۔ انسان کو کاملیت کی جستجو ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اسی لیے وہ ترقی کرتا ہے۔ اس کے مطابق ترقی کے پانچ ادوار ہوتے ہیں۔

(الف) معصومی کا دور (AGE OF INNOCENCE) جس میں عقل کا اظہار اندھی جبلت کی شکل میں ہوتا ہے۔

(ب) اقتدار کا دور (AGE OF AUTHORITY) جس میں عقل منفی تقلید کے ماتحت ہوتی ہے۔

(س) حقیقت سے بے اعتنائی کا دور (AGE OF INDIFFERENCE TO TRUTH) جس میں عقل کو مکمل طور پہ مسترد کر دیا جاتا ہے۔

(د) سائنس کا دور (AGE OF SCIENCE) جس میں حقیقت کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور عقل سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

(ج) فن کا دور (AGE OF ART) جس میں انسانیت آزاد ہوتی ہے اور عقل کامل کے تصور کو موزوں اور مناسب بنا کر اپنے کو خوبصورت بناتی ہے۔

(۸) ماقبل عمرانیات معاشرتی نظریات۔ اب تک کے رجحانات کے سبب یہ احساس زور پکڑتا گیا کہ معاشرہ کی اصلاح ضروری ہے۔ بہت سے مفکرین نے اصلاح کے منصوبے بھی پیش کیے مگر یہ محسوس کیا گیا کہ جو بھی منصوبہ پیش کیا گیا ہے اس کی بنیاد ایک بد قسمت طبقہ سے ہمدردی ہے نتیجہ کے طور پر وہ پوری انسانیت کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک طبقہ تک ہی محدود ہے وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح کے طلبا و مفکرین اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر ہم معاشرتی اصلاح کو بامقصد اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں تو اس کی بنیاد معاشرہ کے ایک نئے علم (SCIENCE) پہ ہونی چاہئے جس کا ارتقا بہت ضروری ہے۔ اے ڈبلو اسمال (A.W.SMALL) اسی خیال کا حامی تھا جس نے معاشرتی اصلاح اور عمرانیات کے مابین ربط اور تعلق کی تشریح کی۔ سینٹ پیرے (SAINT PIERRE) نے ترقی کے نظریہ کو آگے بڑھایا اور اس بات کی وضاحت کی کہ انسان کا مستقبل خود اس کے ہاتھوں میں ہے۔ انسان ایک بہتر اور خوش آئند مستقبل کا منصوبہ بنا سکتا ہے اور اس کے حصول کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ

میں انسان کو پہلے معاشرتی علوم پر انحصار کرنا چاہئے اور پھر دانشوروں کی ایک ایسی درسگاہ پر جوخوش آیند مستقبل کی منصوبہ بندی میں معاون ثابت ہو۔ ٹرگاٹ (TURGOT) نے تاریخی تسلسل کے نظریہ کی وکالت کی ۔ اس کے مطابق مجموعی ہیئت ارتقار کا مطالعہ اہم ہے اور اسی کے ساتھ تاریخ کے مختلف ادوار کے درمیان سببی ربط وضبط کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

مارکوس۔ ڈی۔ کنڈورسٹ (MARQUIS DE CONDORCET) (۱۷۴۳—۱۷۹۴ء) نے فرانس کے انقلاب کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ مدتوں سے ایک نئی تہذیب کے لیے جو زمین ہموار کی جارہی تھی فرانس کا انقلاب اسی کا نتیجہ تھا۔ کنڈورسٹ پہلا مفکر تھا جس نے معاشرہ سے متعلق سائنسی نظریہ اور خیال پرستانہ نظریہ کو یکجا کیا۔ سینٹ سائمن SAINT SIMAN (۱۷۶۰—۱۸۲۵ء) اپنے زمانہ کا مشہور مفکر تھا جس نے ایک نئے علم کا خاکہ تیار کیا جو بعد میں ایک نئے معاشرتی علم کے ارتقار میں حد درجہ معاون ثابت ہوا ۔ اس کے نظریہ کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) علم کے تمام شعبہ جات میں سائنس کو آرٹ سے الگ کرنا چاہئے اور اس میں امتیاز کرنا چاہئے۔

(۲) سائنس کی تقسیم پیچیدگی کے لحاظ سے کرنا چاہئے۔ یعنی ان کو مختلف درجات میں ان کی پیچیدگی کے لحاظ سے رکھنا چاہئے جو سائنس سادہ ہو اس کو نچلے درجہ میں جو پیچیدہ ہو اسے اوپر کے درجہ میں اور جو پیچیدہ تر ہو اسے اعلیٰ درجہ میں رکھنا چاہیے۔ اس نے مزید واضح کیا کہ جس سائنس کا خاکہ اس نے تیار کیا ہے اور جس کا نام 'لاسائنس پولیٹیک' (LA SCIENCE POLDTIQUE) دیا ہے اس کو سائنس کی درجہ وار ترتیب یا سلسلہ مدارج میں اعلیٰ مقام پہ رکھا جانا چاہیے۔

(۳) نئی سائنس کا انحصار مستحکم تاریخی استقرار اور مشاہدہ پہ ہونا چاہیے مزید اس میں 'ترقی' 'نشوونما' اور 'نمو' کے تصورات سے گرم جوشی پیدا کرنی چاہیے اور نئی روح پھونکنی چاہیے۔

(۴) ترقی کا عمل انسانی فطرت ہے۔ نسل کا نفسیاتی ارتقا "سہ منازل قانون" پر مبنی ہے جو کنجکچرل (CONJUCTURAL) مائی کنجکچرل (MICONJUCTURAL) اور پازیٹو (POSITIVE) ہے۔

(۵) ترقی کے عمرانیاتی نظریات کی بنیاد ہی بنیادی قانون ہونا چاہیے۔

(۶) نئی اخلاقیات کی بنیاد قانون الٰہی نہ ہو بلکہ معاشرتی زندگی کے عملی حالات ہوں۔

(۷) تغیر نوعی (TRANSFORMATION) کی تکمیل کے لیے ایک نئی صنعتی تنظیم، ایک نیا

معاشرتی وسیاسی نظام اورنئی اخوت کی بنیاد پر یورپ کے ممالک کی ایک تنظیم ہونی چاہیے۔

اس کے بعد فرانس کے دوسرے مشہور مفکر آگسٹ کامٹ AUGUST COMTE (۱۷۹۸ — ۱۸۵۷ء) نے اپنے موروثوں کے خیالات ونظریات کو ربط وترتیب دے کر منظم کیا اور معاشرہ کی ایک نئی سائنس کی داغ بیل ڈالی۔ اس نے ۱۸۳۹ء میں ایک نیا لفظ سوشیالوجی (SOCIOLOGY) تراشا جس کی وجہ سے وہ عمرانیات کا موجد کہلایا۔ اس علم کے تحت اس نے معاشرہ کا مطالعہ سائنسی اسلوب کے ذریعہ شروع کیا اور دوسروں کو اسی طرح معاشرہ کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ کامٹ نے تین اہم نظریات پیش کیے ثبوتیت (POSITISM) کا نظریہ۔ سہ منازل قانون (LAW OF THREE STAGES) اور علوم کی درجہ وار ترتیب کا نظریہ (HIERARCHY OF SCIENCES)۔

یہ ذہنی رجحانات اور علمی نظریات جو عہد جدید میں رونما ہوئے اور جن کے ذریعہ معاشرہ کا مطالعہ کیا گیا یہ بتاتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی اور معاشرہ کو بہتر بنانے کے لیے کیا کیا کاوشیں کیں اور کس طرح جوکھم بھرا ایک طویل سفر طے کیا۔ گو کہ یہ سفر اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا مگر اس سے اتنی بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ اس سفر کا رخ مادیت کی طرف رہا اور ہم تیزی سے مادیت کی طرف گامزن ہوئے۔ جتنے بھی نظریات قائم کیے گیے ان کی بنیاد مادی فوائد ہی تھے۔ بہر حال ان علمی نظریات کے تجزیہ سے کچھ باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) سائنس ایک اعلیٰ درجہ کا علم ہے۔ اس کے ذریعہ ہم صحیح اور حقیقی علم حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲) سائنسی اسلوب وہ واحد اسلوب ہے جس کے ذریعہ رموز کائنات کو سمجھا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ جو نظریہ قائم کیا جائے گا وہ صحیح اور حقیقی ہوگا۔

(۳) سائنس کے ذریعہ ہی انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا نشوونما ہوسکتا ہے اور فرسودہ خیالات میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ اور بہتر فوائد پہونچا کر اس کی بقا کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

(۴) طبیعیاتی علوم کی ترقی کی وجہ سے انسانی زندگی کا مادی پہلو ارتقا کے منازل تیزی سے طے کر گیا ہے۔ اس کے بالمقابل غیر مادی پہلو ابھی تک ارتقا کے نچلے منازل میں ہے جس کی وجہ سے زندگی کے مادی وغیر مادی پہلوؤں میں ایک خلیج حائل ہوگئی ہے۔ انسانی زندگی

کا غیر مادی پہلو ابھی تک پچھڑے پن کا شکار ہے۔ نتیجہ کے طور پر معاشرہ کو ایک بحران کا سامنا ہے۔

(۵) معاشرہ کی ترقی و نشوونما کے لیے تغیر نوعی (TRANSFORMATION) کا عمل ضروری ہے۔ انسانوں کو عموماً اور مریدین اصلاح کو خصوصاً اس بات کے لیے کوشاں ہونا چاہیے کہ یہ عمل نہ صرف جاری وساری رہے بلکہ اس میں تیزی آئے۔ مفکرین، مدبرین، دانشوروں اور سائنس والوں کو اس سلسلہ میں سائنسی اسلوب سے معاشرہ کا مطالعہ کر کے ایسے نظریات کو نشوونما دینا چاہیے جو اس عمل میں تیزی لانے میں معاون ثابت ہوں۔

(۶) معاشرہ کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سائنسی اسلوب سے اس کا مطالعہ کریں اور اس سے متعلق صحیح اور حقیقی علم کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔ معاشرہ سے متعلق اصلاح کے منصوبے اسی وقت کارآمد اور کارگر ہو سکتے ہیں جب ان کی بنیاد صحیح اور حقیقی علم پر ہو۔

(۷) معاشرہ کا صحیح اور حقیقی علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم معاشرہ کی ایک نئی سائنس کا ارتقا کریں جن کی بنیاد سائنسی اسلوب پہ ہو اور جو تغیر نوعی کے عمل سے متعلق ہو۔

مندرجہ بالا امور پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں۔

(۱) کیا سائنس کے ذریعہ ہم کائنات کے تمام امور، واقعات حقائق نفس الامری اور اشیاء مدرکہ کا صحیح اور حقیقی علم حاصل کر سکتے ہیں؟

(۲) کیا سائنسی اسلوب ہی کائنات کے تمام امور و رموز کا صحیح علم بہم پہونچانے میں ہمارا معاون ہو سکتا ہے؟

(۳) کیا ہمارے تمام غموں کا مداوا سائنس ہی ہے؟

(۴) بہتر زندگی کا تصور کیا ہے؟ کیا بہتر زندگی صرف آرام و آسائش کی ہی زندگی ہے؟ کیا اس کا معیار مادی خوشی، راحت اور لذت ہی ہے۔ جو وقتی ہوتی ہے۔

پہلے تینوں مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ واقع یہ ہے کہ اس کائنات کے تمام امور، واقعات اور حقائق ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان کے مطالعہ اور تجزئے سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اپنی ہئیت اور فطرت کے اعتبار سے وہ مختلف اقسام کے ہیں اور انھیں مختلف درجات میں رکھا جا سکتا ہے۔ موٹے طور پر کائنات کے تمام امور اور حقائق کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ مادی اور غیر مادی یا روحانی، مادی امور وہ ہیں جن کو

حواس خمسہ کے ذریعہ سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ ان کے متعلق علم اور واقفیت حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔ ان امور کے بارے میں ہم مشاہدات و تجربات سے علم حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان کی ہیئت اور فطرت کا مطالعہ کرنے کے لیے آلات اور مشینوں کی مدد لیں تاکہ ان کے متعلق مزید علم حاصل کیا جاسکے۔ مادی امور کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ یہ بے لوچ اور سخت گیرانہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے متعلق جو علم حاصل ہوتا ہے اور جو نظریہ قائم کیا جاتا ہے وہ بھی بے لوچ اور سخت گیرانہ ہوتا ہے۔ اس طرح مشاہدات اور تجربات سے جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ صحیح، درست، جچا تلا، باقاعدہ اور قطعی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم جب پانی کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ دو اہم اجزاء ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنتا ہے اور جس کا تناسب ۲، اور ا کا ہوتا ہے یہ جانکاری درست ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شخص دنیا کے کسی بھی خطہ اور کسی بھی وقت پانی کے اجزاء ترکیبی کا مطالعہ کرے تو اسے اسی حقیقت کا پتہ چلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس دانوں نے جو جانکاری اور جو علم دنیا کو دیا وہ صحیح۔ باقاعدہ اور باترتیب ہے اور جس کی بناپر اپنی ذہنی کاوش اور اختراع کے ذریعہ مختلف مشینیں اور اوزار کی تخلیق کرکے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور انسانوں کو زبردست مادی فائدہ پہونچایا۔ دراصل سائنس کے مطالعہ کا موضوع یہی مادی امور ہیں۔

غیر مادی امور مادی امور کے مقابلے میں حد درجہ پیچیدہ ہیں۔ ان کا مطالعہ حواس خمسہ کے ذریعہ اس طرح نہیں کیا جاسکتا جس طرح مادی امور کا مطالعہ کیا جاتا ہے صرف حس اور عقل کے ذریعہ ہم ان امور کے بارے میں اندازہ لگاتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ کا استعمال بہت دشوار ہے اور اگر ان کا استعمال کیا بھی جائے تو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ صحیح، درست اور قطعی نہیں ہوتا۔ وہ فرد، وقت، خطہ اور زمان ومکان کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ حق کیا ہے تو اس کی واقفیت اور علم ان مشاہدات اور تجربات سے جن کا استعمال مادی امور کے مطالعہ میں ہوتا ہے۔ دشوار ہے۔ اور اگر ہم مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ اس کا مطالعہ کریں تو جو نتیجہ اخذ کریں گے وہ دوسروں کے مشاہدہ اور تجربہ سے اخذ کیے گئے نتیجہ سے بالکل مختلف بھی ہوسکتا ہے حق سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "حق خوبصورتی ہے اور خوبصورتی حق" اس کے پیچھے بلا شبہہ ایک فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اس کا سائنسی تجزیہ بہت دشوار اور مشکل ہے۔ اسمیں دو الفاظ حق اور خوبصورتی ہیں۔

دونوں کا تعین حد درجہ پیچیدہ ہے ان تصورات کی بنیاد اقدار کے نظام (VALUE SYSTEM) سے ہے جو ایک مخصوص ترکیب حوالگی یا نظم حوالگی (FRAME OF REFERENCE) میں سمجھے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ اس دائرہ کے باہر ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے موضوع ہیں۔ جیسے مافوق الفطرت یا مافوق البشری قوت کا تصور، علم الٰہیات، قدروں کا نظام، اچھائی برائی کا تصور، بہتر زندگی کا تصور، روح ضمیر اور خوبصورتی۔ ان موضوعات کا درست اور صحیح علم فراہم کرنے میں سائنس اور سائنسی اسلوب بے دست و پا نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روحانی امور کے مطالعہ کے لیے سائنس سے زیادہ بہتر اور اعلیٰ اسلوب بھی درکار ہے۔ اسپنسر (SPENCER) برطانیہ کا ایک مشہور مفکر ہوا ہے۔ وہ معاشرتی ارتقا کا حامی و علمبردار تھا جس کی وجہ سے اسے برطانیہ کا ڈارون کہا جاتا ہے۔ اس نے جب کائنات کے امور پر غور کیا تو انھیں تین درجات میں تقسیم کیا۔ ۱۔ نامیاتی (ORGANIC) ۲۔ غیر نامیاتی (INORGANIC) اور ۳۔ فوق جسمی یا روحانی (SUPER ORGANIC) معاشرتی امور اس کے مطابق فوق جسمی تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ روحانی امور کے صحیح اور حقیقی علم کے لیے ایک اعلیٰ علم (SUPER SCIENCE) کی ضرورت ہے۔

یہاں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ سائنس ایک ذریعہ (TOOL) ہے کسی مقصد کے حصول کا۔ وہ بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ عموماً سائنس کو معاشرتی تغیر نوعی (SOCIAL TRANSFORMATION.) کے لیے استعمال کیا گیا جس کے ذریعہ زندگی کو مادی نقطۂ نظر سے بہتر بنایا گیا۔ مگر روحانی امور کا علم یا مذہب بذات خود مقصد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حق کی تلاش، اس کی جستجو، اس پر عمل اور اس کی تقلید۔

اگر دنیا میں بہتر سے بہتر طریقہ سے مادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہی زندگی کا نصب العین ہے تو بلاشبہ سائنس ہی ہمارے غموں کا مداوا ہے۔ لیکن اگر زندگی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے اور اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ سائنس آج تمام ترقی کے باوجود انسانیت کو سکون و آرام نہیں پہونچا سکی بلکہ انسانی بقا کے لیے خود ہی سب سے بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ دراصل انسانوں کے دکھ درد کا علاج اور ان کے غموں کا مداوا اس نظام حیات میں مضمر ہے جو ہمارے رب نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے انسان اس زمین پر بہتر طریقے سے زندگی گزار سکتا ہے اور اللہ کے دین کو قائم

کر کے معاشرہ میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر سکتا ہے اور اسے استحکام بخش سکتا ہے۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے انسانیت کے بقا کو بامقصد اور یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک چوتھے مسئلہ کا تعلق ہے ہمیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ یورپ کے معاشروں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جن نظریات کا ارتقا ہوا اس کی بنیاد مادی فوائد اور مادی لذتیں ہی رہیں، معاشرہ میں جو بھی ترقی طبیعاتی اور نظریاتی لحاظ سے ہوتی اس کا محور مادی بہتری ہی رہا۔ ان خیالات و نظریات کو جو انسانی زندگی کے روحانی پہلو سے متعلق تھے عموماً اور خدا کے تصور کو خصوصاً چیلنج کیا گیا یہاں تک کہ اس زمانہ کے مذہب میں تبدیلیاں لائی گئیں اور اس کو زیادہ دنیاوی اور عملی بنانے کا دعویٰ کیا گیا اس کی مثال ہمیں پروٹسٹنزم کے ارتقا سے ملتی ہے جس کے لحاظ سے عیسائیت کو زیادہ دنیاوی اور عملی بنانے کی کوشش کی گئی۔ چونکہ اس دور میں مذہب کا استعمال عوام کے استحصال کے لیے کیا گیا اور وہ طبقہ جو مذہب کا نام لیتا اور اس کا حامی تھا مذہب کو اپنے ذاتی مفاد اور اپنے خود غرضانہ اعمال کو جائز قرار دینے اور ان کا جواز پیش کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا اس لیے لوگ مذہب سے متنفر تھے اور اسے قدیم اور فرسودہ طرز زندگی کا حصہ سمجھتے تھے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور مقصد زندگی کا تعین کیسے ہو؟ کیوں کہ اسی سے بہتر زندگی کا تصور بھی وابستہ ہے۔ مغربی علماء کے نظریات کے تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہتر زندگی کا معیار مادی فوائد میں اور اس معیار کا تعین سائنسی اسلوب اور منہاج تحقیق سے ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ بہتر زندگی کی بنیاد مادی فوائد ہیں تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ بہتر سے بہتر کھانا کھانا۔ بہتر سے بہتر کپڑا پہننا۔ بہتر سے بہتر مکان میں رہنا یا بہتر سے بہتر طریقے سے ضروریات زندگی پورا کرنا یا زندگی گذارنا انسانی بقا کا مقصد ہے۔ مگر یہ بات انسانی ذہن اور انسانی عقل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ مادی آرام و آسائش اور مادی لذت جو عموماً وقتی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی اور بھی ضروریات ہیں جو مادی ضروریات سے زیادہ اہم ہیں اور جن کا تعلق انسانی زندگی کے روحانی پہلو سے ہے۔ ان ضروریات کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ اگر ان کی تکمیل میں ہوتی تو انسانی زندگی حیوانی زندگی کے مانند ہو جائے گی۔ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اللہ کا وجود ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی کتاب ہے اور اس کا عطا کیا ہوا دین ہے۔ اس حقیقت کو

قرآن شریف میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (۴۲ : ۱۳)	اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو دین۔

اس طرح اللہ کو پہچاننا، اس کی اطاعت کرنا اور اس کے دین کو قائم کرنا انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر معاشرہ کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کی اجتماعی اور ملی زندگی کے آغاز سے لے کر اب تک انسان کی اس روحانی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس کی تکمیل کی کوشش کی گئی۔ گو کہ اس کی صورت مختلف ادوار اور مختلف معاشروں میں مختلف رہی اور انھیں کی بنا پر اقدار کے نظام کا ارتقا ہوا جس کا محور بہتر زندگی کا تصور تو تھا لیکن یہ تصور یقینی طور پر روحانی تھا نہ کہ مادی۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ مادی آرام و آسائش کا انحصار دولت پر ہے۔ دولت کمانے میں انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو کر حرص و ہوس کا شکار ہوتا ہے اور ہمیشہ اس بات کا کوشاں ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے جس کے لیے اسے جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہیں رہ جاتی۔ زیادہ دولت کمانے کے لیے وہ دوسروں کے استحصال سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس طرح معاشرہ میں مجادلہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ اس کے تحفظ اور مزید دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جس کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ ان افراد کے خلاف جن کے پاس دولت ہوتی ہے آواز اٹھاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ان کی دولت میں اس کا بھی حصہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ مادی آرام و آسائش معاشرہ کے تمام افراد کو یکساں میسر نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے انسان خود ہی ایسی ترکیبیں اختیار کرتا ہے جس سے اس کو تو مادی آرام و آسائش حاصل ہو مگر دوسروں کو نہ ہو۔ انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر

اب تک انسان برابر اس بات کا کوشاں رہا کہ ان تمام ذرائع پہ قبضہ جمایا جائے جس سے دولت حاصل ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے جنگ و جدل کا ماحول پیدا ہوا۔ دوسروں پر غلبہ اور تسلط حاصل کرنا انسان کی فطرت ہے۔ سائنس نے قدیم نظام اور قدیم قدروں کو تو بدل ڈالا لیکن وہ انسان کی یہ فطرت نہ بدل سکی۔ آج بھی فرد، گروہ ملت اور قوم اقتدار کی دوڑ میں لگے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے حیران و پریشان ہیں۔ سائنس کی مدد سے ایسی ایسی مشینیں اور تراکیب ایجاد کی گئی ہیں جن کے ذریعہ ایک لمحہ میں ساری دنیا کو تہہ و بالا کیا جا سکتا ہے۔ انسانیت کے لیے یہ چیزیں کس قدر ہیبتناک ہیں اس کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ وہ سائنس جس کا ارتقا اس لیے کیا گیا تھا کہ انسان کو آرام و آسائش اور بہتر زندگی سے روشناس کرایا جائے وہی سائنس آج انسان کی بقا کے لیے خود ہی خطرہ بن گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہتر زندگی کے مادی تصور نے جنگ و جدل کو فروغ دیا۔

دراصل مقصدِ زندگی کا تصور خدا کے تصور سے وابستہ ہے۔ کائنات کی تخلیق امر اتفاقیہ نہیں ہے۔ اس کی تخلیق ایک اعلیٰ قوت اور اعلیٰ طاقت نے سوچ سمجھ کر کی ہے۔ وہ اعلیٰ طاقت بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اسے اللہ کہتے ہیں۔ وہ سب سے اعلیٰ اور اشرف ہے۔ وہ کائنات کے تمام امور و رموز کا جاننے والا ہے اور سب سے بڑا عالم ہے۔ اس کے ہم پلہ اور ہمسر دنیا کی کوئی طاقت اور قوت نہیں ہے۔ وہ لامحدود ہے۔ اس کے ایک حکم سے ہماری جیسی ہزارہا دنیائیں قائم ہو سکتی ہیں اور تباہ و برباد ہو سکتی ہیں۔ اس نے کائنات کی تمام مخلوقات کی بھی تخلیق کی جس میں انسان بھی شامل ہیں۔ انسان کو دوسروں کے مقابلہ میں اس نے بہتر صلاحیتیں عطا فرمائیں۔ لیکن اس کی صلاحیتیں بھی محدود ہیں۔ اللہ نے انسان کی تخلیق مٹی سے کی اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ مٹی کائنات کا کمترین عنصر ہے اور روح اعلیٰ ترین۔ اس طرح انسان کے ضمیر میں مادی اور روحانی دونوں اجزاء ہیں اور وہ کمترین اور اعلیٰ ترین دونوں صلاحیتوں کا مرکب ہے جب وہ دنیا کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اور وقتی مادی لذتوں اور راحتوں کے لیے اپنے نفس کی غلامی اور اطاعت کرتا ہے تو اپنے وجود کو کیچڑ میں گراتا ہے اور اس سے کمترین افعال سرزد ہوتے ہیں اور جب وہ معبود حقیقی کا قرب حاصل کرتا ہے اور ابدی روحانی لذتوں اور راحتوں کے لیے اپنے رب

کی غلامی کرتا ہے تو اپنی روح کو بالیدگی بخشتا ہے اور اس سے اعلیٰ ترین افعال انجام پاتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو عقل، فہم، ادراک ضمیر اور قلب عطا کیا ہے جس کی مدد سے اللہ کو پہچاننا اور اس کی اطاعت کرنا انسان کا فرض اولین ہے۔ اگر انسان کو اس سلسلہ میں کوئی دشواری ہوتی ہے تو اسے نظامِ الٰہی پہ غور و خوض کرنا چاہیے جس سے کائنات کا نظام چلتا ہے۔ کائنات کے تمام عناصر باقاعدہ اور باترتیب اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں۔ اگر اس میں ذرا بھی فرق آجائے یا وہ ایک لمحہ کے لیے اپنا کام بند کردیں تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سب کے سب نظامِ الٰہی کے پابند ہیں۔ اسے غور کرنا چاہئیے کہ اللہ نے جو کائنات بنائی ہے وہ کیا خوب ہے۔ اور اس میں پائی جانے والی چیزیں کیا خوب ہیں۔ وہ انسان کی بقا کے لیے کتنی ضروری ہیں اور کس قدر انسان کو راحت و آرام پہنچاتی ہیں اور انسان کس قدر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ سب اللہ کی قدرت اور نعمت ہے اور اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اللہ کی ان نعمتوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ	وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے
لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَالنَّھَارَ مُبْصِرًا ؕ	رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل
اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ	کرو، اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ
وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ○	ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے
ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ۘ	مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ
لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؗ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ○	(جس نے تمہارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمہارا
کَذٰلِکَ یُؤْفَکُ الَّذِیْنَ کَانُوْا بِاٰیٰتِ	رب ہے، ہر چیز کا خالق اس کے سوا کوئی
اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ○ اَللّٰہُ الَّذِیْ	معبود نہیں پھر تم کدھر سے بہکائے جا رہے
جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ	ہو؟ اسی طرح وہ سب لوگ بہکائے
بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ	جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار
وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ	کرتے تھے۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے
اللّٰہُ رَبُّکُمْ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ	تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور
الْعٰلَمِیْنَ ○ ھُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰہَ	اوپر آسمان کو گنبد بنا دیا۔ جس نے تمہاری
اِلَّا ھُوَ فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ	صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی جس نے

الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
(۴۰ : ۶۱ – ۶۵)

ہمیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے۔ وہ کائنات کا رب وہی زندہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

اس کے آگے ارشاد فرمایا :۔

"وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔ وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی ہے موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے، بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔ (۴۰ : ۶۷-۶۸)

یہ اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ کائنات کا ایک خالق ہے جو کائنات کا سارا نظام خوش اسلوبی سے چلاتا ہے اور جس نے انسانوں کو بیش بہا نعمتیں عطا کی ہیں۔ انسانوں کی زندگی اور موت کا وہ مالک ہے۔ وہ انھیں ایک نظم کے تحت پیدا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اپنے پاس بلا لیتا ہے تاکہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو سکیں کہ زندگی اور موت اللہ ہی کے دائرۂ اختیار میں ہیں۔ اگر ان باتوں سے بھی انسان پر دنیا کی سب سے اہم حقیقت یعنی خدا کے وجود کا انکشاف نہیں ہوتا تو اسے اس کی ہٹ دھرمی ہی کہا جا سکتا ہے۔ آج کا انسان جو علم کا دعویدار ہے اس کے لیے یہ ہٹ دھرمی زیب نہیں دیتی۔ اس کے بڑے بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں جن سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

خدا کے بارے میں صحیح علم کے حصول کا سب سے بہتر اور محفوظ ذریعہ وحی ہے۔ وحی کا تعلق خود اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ اس ذریعہ سے اس نے اپنے بارے

میں جو علم دیا ہے وہ قطعی اور کامل ہے۔ یہ علم پیغمبروں کے واسطے سے ملتا ہے۔

جب ہم یہ مان لیتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق اللہ نے کی اور وہی ہمارا رب ہے تو مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔ پھر مقصد زندگی کے تعین میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے بہتر زندگی وہ ہے جسے ہمارے رب نے بتایا ہے۔ اس نے ایک مکمل نظام حیات ہمیں عطا کیا اور یہ بتایا کہ ہمارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب۔ اگر ہمارا ایمان اللہ اور اس کے نظام پر ہے تو اس کے مطابق بہتر زندگی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے۔ اس کے دین کا قیام ہے نہ کہ مادی آرام و آسائش کا حصول۔

اعلان ملکیت سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ فارم ۴ رول ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی۔ دودھ پور، علی گڑھ یوپی

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی

۶۔ ملکیت: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

(۱) مولانا محمد فاروق خاں (صدر) ۱۳۵۲، بازار چتلی قبر دہلی ۶

(۲) جناب افضل حسین (رکن) ״

(۳) جناب سید یوسف (رکن) ״

(۴) جناب سید امین الحسن رضوی (رکن) ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

(۵) ڈاکٹر محمد رفعت۔ شعبہ فزکس۔ جامعہ ملیہ نئی دہلی۔

(۶) مولانا کوثر یزدانی ۱۳۵۲۔ بازار چتلی قبر۔ دہلی

(۷) ٹی۔ کے عبداللہ صاحب الاتھن کنڈی ہاؤس ایلیری کالی کٹ

(۸) ڈاکٹر احمد سجاد۔ بریاتو ہاؤسنگ سوسائٹی کالونی طارق منزل رانچی

(۹) ڈاکٹر حمید اللہ۔ شعبہ انگریزی۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

(۱۰) مولانا سید حامد علی۔ میران پور کٹرہ۔ شاہجہاں پور۔ یوپی۔

(۱۱) سید جلال الدین عمری (سکریٹری) پان والی کوٹھی۔ دودھ پور، علی گڑھ

مندرجہ معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر: سید جلال الدین عمری۔